مجذوب سندھی کی چند الہامی باتیں

(سعید احمد اکبر آبادی)

کسی قوم یا ملک کے معاملات و مسائل پر جو لوگ غور کرتے اور اس کی پیچیدہ ترگتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو پیشِ نظر مشکلات و معاملات کا حل سوسائٹی کے عام قوانین اور مروجہ عوائدِ رسمیہ کی حدبندیوں کے اندر محصور رہ کر سوچتے ہیں اور اس بنا پر ان کی زبان و قلم سے کبھی کسی ایسے فکر کا ترشح نہیں ہوتا جو لوگوں کے عام معتقداتِ مذہبی و افکارِ قومی کی دنیا میں کوئی ہنگامہ برپا کر سکے اس قسم کے حضرات سچ مچ غالب کے اس شعر کا مصداق ہوتے ہیں ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

اس کے برخلاف مفکرین کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو انقلابی ذہن سے ان مسائل کا حل سوچتا ہے اور اگر اس حل کی راہ میں پرانے اور مروجہ رسوم کی کسی خاص ہیئت و وضع کو صدمہ بھی پہنچتا ہے تو وہ اس کی ذرا پروا نہیں کرتا چونکہ ہر حال اپنے ماضی کا قدرتی اور طبعی نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اس قسم کا مفکر ماضی کا مطالعہ بے تعصبی سے غور و خوض کے ساتھ کرتا ہے، اس کی تحلیل کر کے چند اصول متعین کرتا ہے اور پھر ان اصول کی روشنی میں حال اور اس سے آگے بڑھ کر مستقبل کے معاملات و مسائل پر نگاہ ڈالتا ہے اس سلسلہ میں وہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ ماضی کی تعمیر کے اصل خدوخال کیا ہیں اس کی ہیئت کذائی میں کن عناصر کو عناصرِ حقیقی کی حیثیت حاصل ہے اور اس میں کون سی اور کتنی چیزیں ایسی ہیں جو کسی عمارت میں موسمی تغیرات کی مانند کسی خاص خارجی سبب کے باعث پیدا ہوگئی

ہیں پھر اس دیدہ وری کے ساتھ اُس میں اتنی جرأت و جسارت بھی ہوتی ہے کہ وہ درخت کی غیر ضروری اور فضول شاخوں کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور اس طرح اپنی حقیقت شناسی واقعیت پروری کے چہرہ کو رسم پرستی کے داغ سے محفوظ کر لیتا ہے اُس کی طبیعت کی یہ افتاد اور اُس کے فکر کا یہ طریق اس کو اس درجہ روشن دماغ۔ عالی حوصلہ اور وسیع النظر بنا دیتا ہے کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اُس کا فکر بھی بدلتا رہتا ہے اس کی طبیعت میں جمود نہیں ہوتا اُس کا ذہن رجعت پسندی کے عیب سے پاک ہوتا ہے وہ پرانی لکیر کا فقیر نہیں بنا رہتا بلکہ اس کی مثال اس طبیبِ حاذق کی سی ہوتی ہے جو مرض کی نوعیت اور موسم کے اثرات کے بدلنے سدلنے کے ساتھ نسخہ کے اجزاء میں بھی ترمیم و تنسیخ کرتا ہے اور ہر مرض کے لئے ایک ہی نسخہ اور ایک ہی دوا تجویز نہیں کرتا۔ اس دوسری قسم کا مفکر ہی درحقیقت انقلابی مفکر کہلاتا ہے اور پہلی قسم کے مفکر کو رجعت پسند کہنا چاہتے۔ مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ میں اسی دوسری قسم کے واحد انقلابی مفکر تھے اور اپنی اس حیثیت میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ان کے علاوہ اس دور میں جتنے مسلمان زعما اور مفکر پیدا ہوتے وہ سب مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر خدا دندان جمعیت علما تک اپنے علمی و عملی کمالات و اوصاف کے باعث مسلمانوں کے خواہ کتنے ہی لائق تعظیم و احترام رہنما ہوں لیکن افسوس ہے انھیں انقلابی مفکر نہیں کہا جا سکتا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا چونکہ انقلابی مفکر کے ذہن میں جمود نہیں ہوتا اور وہ عوائد سیمیہ کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر معاملات و مسائل پر غور کرتا اور اُن کا حل سوچتا ہے اس لئے ابتداءً سوسائٹی کا مزاج اس کے فکر کو قبول کرنے سے عمومی طور پر انکار کرتا ہے اور رجعت پسند و قدامت پرست طبائع اس پر سب و شتم کی بوچھار شروع کر دیتی ہیں۔ مذہب کی زبان میں گفتگو کرنے والے اس کو ملحد اور زندیق کہتے ہیں سماجی آداب کی اصطلاح میں اس کو رند مشرب یا آزاد خیال کہا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی عظمت کا انکار نہیں

ترقی پسند یہ بوجوہ نہیں کہہ باعث اس کے افکار کے ساتھ ہم آہنگی بھی نہیں کرتے وہ کبھی دبے دبے لفظوں میں اور کبھی کھل کر اسے مجذوب یا دیوانہ کہتے ہیں چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ بھی یہ ہی معاملہ ہوا کہنے والوں نے انھیں کیا کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ جو ان کے سالہا سال کے رفیق تھے اور مولانا کی دماغی و علمی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے تھے انھوں نے بھی کبھی اُن کو مجذوب کہا اور کبھی دیوانہ کہہ کر پکارا ان حضرات کی رعایت سے ہم نے بھی اس مقالہ کے عنوان میں مولانا سندھی کو مجذوب سندھی ہی کہا ہے۔

مولانا اپنے افکار کی ہمہ گیر عظمت اور اس کی انقلابیت کے باعث اسلام کی اہم قریب کی تاریخ کے تمام مفکرین اسلام میں نہ صرف ایک قومی بلکہ بین الاقوامی مفکر کی حیثیت سے کتنا اونچا مقام رکھتے ہیں اور ان کے افکار کی بنیاد پر اسلام کو کس طرح ابد کامیاب ترین بین الاقوامی دستورِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کے زیر اثر دنیا میں کس طرح ایک صالح ترین نظامِ زندگی برپا کیا جا سکتا ہے ؟ ان سب سوالات کا جواب تو آپ کو اس زیر تالیف ضخیم کتاب میں ملے گا جو اگر پوری ہو گئی تو اس پر خاکسار مؤلف کو فخر سے یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم اِلا

البتہ اس مختصر مقالہ میں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوگوں نے جس کو کل مجذوب یا دیوانہ کہا تھا آج اس کی چند پیش گوئیاں جو ان لوگوں کے نزدیک "مجذوب کی بڑ" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھیں کس کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جو لوگ رجعت پسندی کے ساتھ قومی و ملکی معاملات پر سوچ بچار کرتے ہیں انھیں کیوں کر اپنے منصوبوں میں ناکامی ہوتی ہے اور اس کے برخلاف جو وسیع النظر اور انقلابی ذہن کا مفکر حالات و واقعات کا ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد ان کی رفتار کو دیکھ لینے کے ساتھ ساتھ فکر کا طریق اور زاویہ ذہن بدلتا رہتا ہے واقعات کے نتائج انجام کار کس طرح اس کے

فکر کی صداقت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔

جنگ عظیم دوم | مولانا ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ تک جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے کراچی اترے اور وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں قیام پذیر ہوئے تعلق خاطر کے باعث ندوۃ المصنفین کے دفتر میں بھی اکثر تشریف لاتے تھے اور مختلف عنوانات و مباحث پر گفتگو فرماتے تھے ایک دن ارشاد ہوا "میرے یقین میں ایک جنگ عظیم عنقریب چھڑنے والی ہے جس میں روس بھی شریک ہوگا اور اگرچہ جنگی اعتبار سے فتح اس فریق کو ہوگی جس کا حلیف روس ہوگا لیکن اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بالکل بدل جائے گا اور کمیونزم کو اس درجہ فروغ ہوگا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے دراصل جیت روس کی ہی ہوگی" میں نے کہا "مولانا! جرمنی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو دنیا کی ایک عظیم الشان طاقت ہے اور اگر اٹلی اور جاپان روس کے حلیف ہو گئے تو کیا یہ سب مل کر بھی فتح حاصل نہ کر سکیں گے؟" مولانا نے اپنی عادت کے مطابق شانِ جلالی کے ساتھ تپائی پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا "ہوں! جرمنی! اس نے اگر روس کی مخالفت کی تو پاش پاش ہو جائیگی اور ہٹلر اور مسولینی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا" پھر پوچھا گیا "مگر مولانا! امریکہ اور برطانیہ کا انجام کیا ہوگا؟" ارشاد ہوا "آئڈیالوجی کے اعتبار سے امریکہ برطانیہ اور روس دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس بنا پر یہ مشکل سے ہی باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے لیکن جہاں تک سیاسی شاطرانہ چالبازیوں کا تعلق ہے امریکہ اور برطانیہ کو روس پر تفوق حاصل ہے اس لئے بعید نہیں یہ دونوں روس کو اپنے ساتھ ملالیں اور اس طرح اس کی مدد سے جرمنی کا خاتمہ کر دیں ساتھ ہی فرمایا "ایک اور بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ اٹلی اور جرمنی کا نظام فاشسٹ ہے امریکہ اور برطانیہ میں جمہوریت قایم ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ ہے لیکن بہرحال

ور نے لگنے کے بہودہ ہونے کے باعث اس کے افکار کے ساتھ ہم آہنگی بھی نہیں کرتے وہ
دبے دبے لفظوں میں اور کبھی کھل کر اسے مجذوب یا دیوانہ کہتے ہیں چنانچہ مولانا علیہ الرحمۃ
سندھی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہنے والوں نے انھیں کیا کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ جو ان کے
سالہا سال کے رفیق تھے اور مولانا کی دماغی و عملی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے تھے انھوں
بھی کبھی اُن کو مجذوب کہا اور کبھی دیوانہ کہہ کر پکارا ان حضرات کی رعایت سے ہم نے بھی
اس مقالہ کے عنوان میں مولانا سندھی کو مجذوب سندھی ہی کہا ہے۔

مولانا اپنے افکار کی ہمہ گیر عظمت اور اس کی انقلابیت کے باعث اسلام کی
قریب کی تاریخ کے تمام مفکرین اسلام میں نہ صرف ایک قومی بلکہ بین الاقوامی مفکر کی
حیثیت سے کتنا اونچا مقام رکھتے ہیں اور ان کے افکار کی بنیاد پر اسلام کو کس طرح
کامیاب ترین بین الاقوامی دستورِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور اس
زیر اثر دنیا میں کس طرح ایک صالح ترین نظامِ زندگی برپا کیا جا سکتا ہے؟ ان
سوالات کا جواب تو آپ کو اس زیر تالیف ضخیم کتاب میں ملے گا جو اگر پوری ہو
تو اس پر خاکسار مؤلف کو فخر سے یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

البتہ اس مختصر مقالہ میں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوگوں نے جس کو کل مجذوب یا دیوانہ
کہا تھا آج اس کی چند پیش گوئیاں جو ان لوگوں کے نزدیک "مجذوب کی بڑ" سے زیادہ
نہیں رکھتی تھیں کس کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں اس کے مطالعہ سے
ہوگا کہ جو لوگ رجعت پسندی کے ساتھ قومی و ملکی معاملات پر سوچ بچار کرتے ہیں ان
کیوں کر اپنے منصوبوں میں ناکامی ہوتی ہے اور اس کے برخلاف جو وسیع النظر اور انقلابی
ذہن کا مفکر حالات و واقعات کا ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد ان کی رفتار کے مطابق لینے کے
حیثیت فکر کا طریق اور محاذ میں بدلتا رہتا ہے۔ واقعات کے نتائج انجام کار کس طرح اس

فکر کی صداقت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔

جنگ عظیم دوم | مولانا ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ تک جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے کراچی اترے اور وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں قیام پذیر ہوئے۔ تعلق خاطر کے باعث ندوۃ المصنفین کے دفتر میں بھی اکثر تشریف لاتے تھے اور مختلف عنوانات و مباحث پر گفتگو فرماتے تھے ایک دن ارشاد ہوا "میرے یقین میں ایک جنگ عظیم عنقریب چھڑنے والی ہے جس میں روس بھی شریک ہوگا اور اگرچہ جنگی اعتبار سے فتح اس فریق کو ہوگی جس کا حلیف روس ہوگا لیکن اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بالکل بدل جائے گا اور کمیونزم کو اس درجہ فروغ ہوگا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے دراصل جیت روس کی ہی ہوگی" میں نے کہا مولانا! جرمنی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو دنیا کی ایک عظیم الشان طاقت ہے اور اگر اٹلی اور جاپان روس کے حلیف ہو گئے تو کیا یہ سب مل کر بھی فتح حاصل نہ کر سکیں گے؟" مولانا نے اپنی عادت کے مطابق شانِ جلالی کے ساتھ تپائی پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا "ہوں! جرمنی! اس نے اگر روس کی مخالفت کی تو پاش پاش ہو جائیگی اور ہٹلر اور مسولینی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا" پھر پوچھا گیا مگر مولانا! امریکہ اور برطانیہ کا انجام کیا ہوگا؟ ارشاد ہوا "انڈیا لوجی کے اعتبار سے امریکہ برطانیہ اور روس دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس بنا پر یہ مشکل سے ہی باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے لیکن جہاں تک سیاسی شاطرانہ چالبازیوں کا تعلق ہے امریکہ اور برطانیہ کو روس پر تفوق حاصل ہے اس لئے بعید نہیں یہ دونوں روس کو اپنے ساتھ ملالیں اور اس طرح اس کی مدد سے جرمنی کا خاتمہ کر دیں ساتھ ہی فرمایا "ایک اور بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ اٹلی اور جرمنی کا نظام فاشسٹ ہے امریکہ اور برطانیہ میں جمہوریت قایم ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ ہے لیکن بہرحال

فاشزم کے مقابلہ میں بہتر ہے روس کا نظام کمونزم ہے جو آئندہ چل کر تاریخ اور وقت کے طبعی تقاضہ کے باعث ساری دنیا کا نظام بننے والا ہے اس ترتیب کے اعتبار سے ہونا یہ چاہئے کہ پہلے فاشزم ختم ہو جو ان تینوں میں سب سے زیادہ برا نظام ہے۔ اس کے بعد سرمایہ دارانہ جمہوریت اور کمونزم میں جنگ ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں میں جو صالح تر نظام ہوگا وہ باقی رہ جائے گا اور اس کا حریف ختم ہو جائے گا۔

یہ گفتگو عصر اور مغرب کے درمیان شام کی چاء پر ہو رہی تھی جو کچھ دیر کے بعد رفت گذشت ہو گئی۔ اس کے چند ماہ بعد ہی جنگ شروع ہوئی۔ ہٹلر کی فوجیں طوفانی برق و باراں کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ مشرقی یورپ کے جس ملک کی طرف اس نے رخ کیا وہ مقابلہ کی تاب نہ لاکر اس کے قدموں پر گرتا چلا گیا۔ صبح ایک ملک کی باری تھی اور شام دوسرے کی۔ دنیا کے بچہ بچہ کے دل پر ہٹلر کی عظمت اور اس کی ناقابل شکست طاقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو اتوار کے دن صبح کے تین بجکر منٹ پر ہٹلر نے خود اپنی اور نازی فیشزم کی موت کی دستاویز پر دستخط کیے اور سوویٹ روس کے خلاف اعلان جنگ کر کے اس پر دھاوا بول دیا۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی مفکر اور فوجی ماہر اس وقت جرمنی کی طاقت سے کس درجہ مرعوب تھے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ "۲۵ جون کے نیوز کرانکل" اخبار نے امریکہ کے مشہور فوجی ماہر میجر فیلڈنگ الیٹ کا ایک بیان شائع کیا جس میں انھوں نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ سوویٹ روس کی فوجی اور اقتصادی طاقت جو کچھ ہے ہم کو معلوم ہے اس کے پیش نظر ہرگز اس بات کی توقع نہیں ہو سکتی کہ روس کی سرخ فوج جرمنی کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکے گی" پھر اسی اخبار میں اس صفحہ پر جولیڈنگ آرٹیکل نکلا اس میں بھی ایڈیٹر نے لکھا تھا "جرمنی کے مقابلہ میں روس کی شکست یقینی ہے یہ جنگ زیادہ سے زیادہ موسم خزاں تک چلے گی" فوجی ماہرین و مبصرین کے علاوہ خود انگلینڈ میں رائے عامہ کیا تھی؟ ڈین آف کینٹربری اپنی مشہور کتاب

(The Socialist Sixth of World) میں لکھتے ہیں " روس پر جرمنی کے حملہ کے وقت انگلینڈ میں ہر شخص گورنمنٹ اور محکمہ خارجہ کے ذمہ دار افسروں اور عہدہ داروں سے لے کر نیچے طبقہ کے مزدوروں تک ہر اخبار نویس۔ ہر فوجی ماہر اس بات کی توقع کرتا تھا کہ سُرخ فوج کو مکمل شکست ہوگی اور سوویٹ یونین بالکل تباہ و برباد ہو جائیگی

شروع شروع میں ان لوگوں کا یہ خیال جو ایک طرف جرمنی طاقت سے غیر معمولی مرعوبیت اور دوسری جانب روس اور فن لینڈ کی طوالتِ جنگ کے باعث روس کی طاقت کی طرف سے غلط فہمی پر مبنی تھا صحیح ثابت بھی ہوا چنانچہ جرمنی نے روس کے علاقوں کو پامال کرتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۶ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو جرمنی فوجوں نے ماسکو کے دروازہ پر دستک دی اور ماسکو گورنمنٹ کو وہاں سے منتقل ہو جانا پڑا۔ اب کسی کو شبہ نہیں تھا کہ نپولین بوناپارٹ بھی جس معرکہ کو سرانجام نہیں کرسکا تھا جرمنی کا فیوھرر چند دنوں میں اسے ختم کرکے رکھ دے گا۔

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ مولانا سندھی دفتر بُرہان میں تشریف لے آئے۔ میں نے عرض کیا حضرت! آپ کا یہ خیال تو صحیح نکلا کہ امریکہ اور برطانیہ کی شاطرانہ چال کامیاب ہوئی اور اُس نے روس کو بھی جرمنی کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ لیکن آپ جو روس کی طاقت کی طرف سے اس درجہ خوش گمان تھے وہ تو واقعات کی روشنی میں غلط ثابت ہو رہا ہے سُرخ فوجیں ہر مورچہ پر پٹ رہی اور پسپا ہو رہی ہیں اور ہٹلر کی فوج اُن کے علاقوں کو روندتی ہوئی بڑھی چلی جارہی ہے! مولانا کو اپنے دل و دماغ کے مشاہدہ پر ایسا جزم و یقین تھا کہ یہ سُنتے ہی بپھر پڑے۔ اور شیر کی طرح گرج کر بولے " تم بکتے ہو دیکھ لینا روس کو ہرگز شکست نہیں ہوسکتی غریب ہٹلر کو یا کسی کو پتہ بھی نہیں ہے کہ روس کی ریزرو فوج کتنی کچھ اور کہاں کہاں ہے سائبیریا کے پہاڑوں میں ان کے میگزین ہیں جن کی کسی کو ہوا تک بھی نہیں پہنچی ہے یہ پسپائی تو روس کا خاص طریقۂ جنگ ہے اور ایک فوجی چال کے ماتحت ایسا ہو رہا ہے، جرمن فوجیں

اسٹالن گراڈ تک اسی طرح بڑھتی جاویں گی لیکن پھر وہاں سے پسپا ہونی شروع ہوں گی
سیدھی برلن میں ہی جاکر رکیں گی اور وہاں ہٹلر اور اُس کی حکومت کی موت کی آخری رسم
ادا ہو جائے گی" مولانا نے یہ الفاظ اس زور اور جوش و خروش سے ارشاد فرمائے کہ ہم سب
سُن کر چُپ ہو گئے لیکن دل کہہ رہا تھا کہ مولانا کو واقعات و حقائق کے خلاف خواہ مخواہ اپنی
پر اصرار ہے۔ اور اپنی رائے کے سامنے کسی کی کچھ سُنتے ہی نہیں ہیں:

بات آئی گئی ہو گئی لیکن معلوم ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد جو کسی وحی یا الہام پر مبنی نہیں تھا
جس کی بنیاد اُن کی عمیق قوتِ مشاہدہ اور گہری بصیرت پر قایم تھی کس طرح حرف بحرف صحیح
ثابت ہوا اگر مولانا انگلینڈ یا امریکہ میں ہوتے اور اُن کا یہ بیان وہاں کے اخبارات میں شائع
ہوتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ لائڈ جارج اور بیون سے
اونچا تسلیم کر لیا جاتا۔

جنگ میں شرکت اور حکومت کی فوجی مدد جنگ شروع ہوئی تو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں۔ کانگریس مسلم لیگ
جمعیۃ العلماء نے فیصلہ کیا کہ اس جنگ میں حکومت کی کوئی مدد نہ کی جائے
نہ اس میں چندہ دیا جائے اور نہ فوج میں بھرتی کے لئے آدمی جائیں لیکن مولانا اس رائے کے
سخت مخالف تھے وہ برملا اور بڑے زور کے ساتھ کہتے تھے کہ یہ پالیسی بالکل غلط ہے
اس جنگ میں انگریزوں کی مدد کرنی چاہئے۔ چنانچہ ہمارے فاضل اور عزیز ترین دوست
(لفٹننٹ کرنل) خواجہ عبدالرشید صاحب جو مولانا سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور شاگرد
بھی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں جنگ میں جانا نہیں چاہتا لیکن مولانا نے مجھ کو مجبور کیا اور
فرمایا کہ میں تم کو حکم دیتا ہوں۔ اگر تم نے تعمیل نہیں کی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ دہلی میں ایک
مرتبہ مولانا سے ذکر آیا اور ہم نے پوچھا کہ آپ آخر انگریزوں کی اس ظالم حکومت کے ساتھ
کرنے پر کیوں تلے ہوتے ہیں تو فرمایا "میں حکومت کا ہمدرد نہیں بلکہ خود اپنا اور اپنے ملک
کا ہمدرد ہوں لو سنو! بات دراصل یہ ہے کہ اس جنگ کے بعد ہندوستان کا آزاد ہونا یقینی

ہیونکہ اگر انگریز جیت بھی گئے تب بھی اقتصادی اور فوجی اعتبار سے اور انٹرنیشنل معاملات
وجہ سے وہ اس درجہ کمزور ہو جائیں گے کہ ہندوستان پر اپنی ملوکیت قائم نہ رکھ سکیں گے
ر انھیں مجبور ہو کر ہمیں خود مختاری و آزادی دینی ہوگی پس اگر یہ یقینی ہے تو ہمیں ابھی سے نیشنل
ج اور قومی سول اڈمنسٹریشن کا انتظام کرنا اور ان کے لئے نوجوانوں کو تربیت دینا ہے
جی ٹریننگ کی صورت اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا
زیادہ سے زیادہ اپنے نوجوان فوج میں بھرتی کرائیں فرض کرو اگر اس طرح ہم نے ایک لاکھ نوجوان
ج میں بھیجے اور اُن میں سے پچاس ہزار مر کھپ بھی گئے تو باقی جو پچاس ہزار بچیں گے
ہ تو آزاد ہند کی قومی فوج کے سپاہی ہوں گے جن کے بل بوتے پر ہم حکومت چلا سکیں گے
س کے برخلاف اگر ہم نے جنگ میں عدم تعاون کی منفی پالیسی پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ اس کے
سوا کیا ہوگا کہ کل جب ہم کو آزادی ملے گی تو حکومت کی مشین چلانے کے لئے ہمیں انھیں زنگ
لودہ کل پرزوں سے کام لینا ہوگا جن سے آج انگریزی اقتدار کی مشین چل رہی ہے اور
س کا جو کچھ انجام ہوگا وہ یہی ہوگا کہ عنوان بدل جائیگا مگر معنون وہی رہے گا۔ قالب مختلف
ہوگا مگر اڈمنسٹریشن کی روح وہی رہے گی اس بنا پر ضرورت ہے کہ چند ٹکوں کی خاطر فوج
یں بھرتی ہونے والے ہندوستانی نہیں بلکہ ملک کے سچے ہمدرد اور محب وطن اور صحیح الخیال
ہندو مسلمان نوجوان فوج میں بھرتی ہوں اور اس نیت اور جذبہ سے ملٹری تعلیم حاصل کریں
ہ اب انھیں جلد ہی قومی فوج کی حیثیت سے اپنے ملک کی خدمت کرنی ہوگی ۔

اس خیال اور رائے کے اظہار پر ہمارے مجاہدین آزادی نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔
ن کو ٹوڈی کہا، رجعت پسند بتایا۔ حکومت کا پٹھو کہا یہاں تک کہ انھیں دنوں میں جمعیۃ علماء ہند
اجلاس لاہور میں ہوا اور مولانا وہیں شیرانوالہ میں قیام پذیر تھے تو ان لوگوں نے مولانا سے
ات کرنی تک گوارا نہیں کی۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اگر کانگرس کے رزولیوشن۔ جمعیت کے
نو سے۔ اور مسلم لیگ کے اعلان کے مطابق ایک ہندو ایک مسلمان اور ایک سکھ نوجوان

بھی فوج میں شریک ہو کر ملٹری ٹریننگ نہ لیتا تو آج ہماری جمہوری حکومت کیا کاٹ کی پتلی سے کچھ سوا ہوتی۔

ڈومینین اسٹیٹس | مولانا شروع میں ہندوستان کی مکمل آزادی کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور اس وقت تھے جبکہ کانگرس کے شعور آزادی کے ناخن میں زندگی کے خون کی جھلک بھی پیدا نہیں ہوئی تھی وہ اسی مشن پر کابل گئے اور دنیا جہان کی خاک چھانتے پھرے لیکن روس، ٹرکی اور دوسرے ترقی یافتہ آزاد ملکوں کو دیکھنے کے بعد انھوں نے ہندوستان کے متعلق اپنی رائے بدل لی اور بجائے مکمل آزادی کے ابتداءً آزادی زیر سایہ برطانیہ کے قائل ہو گئے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کا بچہ بچہ مکمل آزادی کے جذبہ سے سرشار ہو رہا تھا اور کانگرس کا ہر کھدر پوش اور جمعیۃ و مسلم لیگ کا ہر کارکن سیاست دانی میں اپنے آپ کو چرچل و چیمبرلین سے کم نہیں جانتا تھا اس بنا پر ظاہر ہے مولانا کی اس رائے کو کیا درخور اعتنا سمجھا جا سکتا تھا۔

مگر مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انگریز دنیا کی اعلیٰ ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ قوم ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندوستانی انتہائی پست ماندہ ہیں ان میں نہ تعلیم ہے، نہ سیاسی شعور اور اس کی اہلیت ہے اور نہ عوام میں شہری زندگی کے فرائض و واجبات کا احساس ہے علاوہ بریں ہندو مسلم تعصبات و اختلافات اور دوسرے اسباب کی بنا پر ہمارے قومی کیرکٹر میں چند در چند ایسی خرابیاں اور نقائص ہیں جن پر ایک اجنبی حکومت کے قیام کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے ان حالات میں اگر ہم نے مکمل آزادی حاصل کی تو یک بیک ہمارے کاندھوں پر ایک ایسا بھاری بوجھ آپڑے گا جس کو ہمارے کاندھے اٹھا نہ سکیں گے اور اس سے ملک کی سماجی حالت ابتر ہو جائے گی۔ مولانا کو کانگرس سے اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ اس نے اپنی کوششوں کو صرف انگریزوں کے یہاں سے نکال دینے پر مرکوز رکھا ہے اور اس کے علاوہ ملک کی تعمیر کے اہم کام اس نے پس پشت ڈال رکھے ہیں مولانا فرماتے تھے کہ آزادی کے بعد

یہاں جمہوریت یا عوامی حکومت قایم ہوگی لیکن جس ملک کے عوام شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس نہ رکھتے ہوں وہاں جمہوریت سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ملک میں بسا اوقات اختلال و خلفشار پیدا ہو سکتا ہے اس بنا پر مولانا کی رائے تھی کہ ہم کو شروع میں آزادی زیر سایہ برطانیہ لینی چاہیئے تاکہ اس مدت میں ہم اپنے عوام کو تعلیم یافتہ کردیں ملک کو صنعتی و حرفتی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک بنا دیں یہاں کی اقتصادی حالت قابل اطمینان ہو جائے اور ملک کے ذرائع پیداوار کا صحیح استعمال کرنا ہم سیکھ جائیں اور گائے اور بھینس پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنا چھوٹ جائیں تو پھر اس وقت بیشک ہم کو مکمل آزادی لینی چاہیئے اور ہم اس آزادی کے بہمہ وجوہ محافظ اور نگراں ہو سکیں گے مولانا کا یہ خیال صحیح تھا یا غلط؟ اور اگر صحیح تھا تو کس حد تک؟ واقعات کی روشنی میں آپ خود سوچیئے اور غور کیجئے۔

تقسیم ہند | جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے مولانا کٹر کانگرسی تھے اور سب سے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اپنے استاذ حضرت شیخ الہند کی زیر ہدایت افغانستان میں کانگرس کی ایک شاخ قایم کی اور وہاں کی پبلک تک اس جماعت کی آواز پہنچائی۔ وہ متحدہ قومیت کے بھی قائل تھے اور ہندوستان کی وحدت کے معترف بھی تھے لیکن جب ۱۹۳۹ء میں ہندوستان آئے اور یہاں کی سیاسیات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ہندو مسلم عوام کے جذبات و رجحانات کو دیکھا ان کے دلوں کو ٹٹولا اور پرکھا تو وہ تقسیم کے قائل ہو گئے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ تقسیم فی نفسہٖ کوئی اچھی یا ضروری چیز تھی بلکہ صرف اس لئے کہ ہندو مسلمانوں کے اختلافات اور ان کی باہمی نفرت و عداوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ مولانا کے نزدیک اب اس سے انحراف کرنا ایک اور بڑے فتنہ کو دعوت دینا تھا لیکن اس میں مولانا اس ترمیم کو ضروری قرار دیتے تھے کہ تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہرگز نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو پاکستان میں ہندو کو اور ہندوستان میں مسلمان کو اپنے ملک کے شہری اور شریک حکومت کی حیثیت سے رہنا ناممکن ہو جائیگا

اور اس سے جو عظیم بربادی آئیگی ایک مدت دراز تک اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ معاشرہ درہم برہم ہو جائیگا اس ملک کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پانی پھر جائیگا بلکہ مولانا کی رائے تھی کہ تقسیم علاقائی کلچر کی بنیاد پر ہونی چاہیئے جو ہندو اور مسلمانوں دونوں میں مشترک ہے اس سلسلہ میں آپ کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ شمالی ہندوستان کا کلچر ہندو مسلمانوں دونوں کا ایک ہے یعنی ایک ہی لباس، ایک سی زبان۔ ایک ہی اندازِ معاشرت۔ لیکن اُس میں مسلمانوں کا کلچر غالب ہے۔ اسی طرح جنوبی اور مشرقی ہندوستان کا کلچر ہے جو اگرچہ دونوں فرقوں کا مشترک کلچر ہے لیکن ہندو تہذیب کے عناصر اس یں غالب ہیں مولانا کا خیال یہ تھا کہ اگر اس طرح تقسیم ہوئی تو مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان پورا ہو جاتا ہے اور پھر آپس میں فرقہ وارانہ کشیدگی بھی نہیں پیدا ہوتی، اپنے اس مخصوص نظریہ کے ماتحت حضرت مرحوم کانگرس کے بھی مداح تھے اور لیگ کے بھی۔ اور ساتھ ہی دونوں کے مخالف بھی۔ کانگرس کے اس لیئے کہ وہ تقسیم منظور نہیں کرتی، اور لیگ کے اس لیے کہ وہ تقسیم بر بناء مذہب کا مطالبہ کرتی ہے اس بناء پر کلچرل اشتراک و مجانست کو بنیاد قرار دیکر آپ نے ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی "سندھ ساگر نربدا......" کے نام سے بنائی تھی اور آپ چاہتے تھے کہ اس پارٹی کے ذریعہ کانگرس اور لیگ دونوں سے لڑیں۔ ہا افسوس! کہ ابھی اس ملک کے آسمان پر آزادی کا سورج طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا اپنے مولاکو پیارے ہو گئے ورنہ آج وہ زندہ ہوتے تو کانگرس لیگ اور جمعیت تینوں کو مخاطب کر کے فرماتے کہ "کفیٰ بنفسك اليوم حسيبا" اور ہم کو یقین ہے کہ کسی کے پاس ان کی بات کا جواب نہ ہوتا۔

مغربی نیشنلزم اس سلسلہ میں ایک اور بات جو مولانا فرمایا کرتے تھے اور جس کو انھوں نے لکھا بھی ہے اور جس کو سُن کر ملک کے عوام و خواص ان کو برا بھلا کہتے تھے وہ یہ ہے کہ آپ کے خیال میں ہندوستان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ٹرکی کی طرح اپنی معاشرت کے پُرانے چولے کو اتار کر رکھدے اور مغربی کلچر جس سے وہاں کی قومیت کا خمیر تیار ہوا ہے اسے